ہے:﴿ومن يَّتقِ اللهَ يجعل له مخرجا ○ ويرزقه مِن حيث لا يحتسب ومن يتوكل على الله فهو حسبه﴾[الطلاق] ہم اگر پاکباز ہوں گے تو کوئی بدنیت دشمن ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

عصر حاضر کے چیلنجوں میں علمائے اسلام کی ذمہ داریوں کو دو نکات میں سمویا جاسکتا ہے:

(۱) فقہ الواقع: علمائے دین ان چیلنجوں کی حقیقت کو سمجھ لیں، کسی چیز کی ماہیت سمجھے بغیر اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ فقہ الواقع کی فراست نصوص کتاب وسنت سے شرعی حکم استخراج کرنے میں رہنمائی کرتی ہے، جس کی بنیاد پر ہم امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

(۲) تقوی کا التزام: انسان جب تک رب کائنات کی مقدس بارگاہ میں مقبول ومحبوب نہ ہو، اس کی تگ ودو رنگ نہیں لاسکتی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:"إنّ الله إذا أحبَّ عبدًا نادى جبريل : أن الله قد أحبَّ فلانا فأحِبه، فيحبُّه جبريل، ثم ينادي في السماء : أن الله قد أحب فلانا فأحبوه فيحبه أهلُ السماءِ ويوضعُ له القبول في الأرض' [البخاري ٧٤٩٥، مسلم ١٥٧(٢٦٣٧)]

تقوی کا اولین تقاضا عقیدہ توحید کی پختگی ہے، انبیاورسل کا مشترکہ عقیدہ ہونے وجہ سے اکثر ادیانِ عالم اور تمام اسلامی فرقوں میں اولین اہمیت عقیدہ توحید کو حاصل ہے، لیکن "توحید" کی تعریف ہر ایک کے پاس جداگانہ ہے۔ علمائے دین کو قرآن مجید کی روشنی میں عقیدہ توحید کی تکمیل پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔

تقوی کا دوسرا بڑا تقاضا اتباع سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ پر عمل میں کسی بھی اسلامی فرقے کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ کتب حدیث کو پڑھ کر رہنمائی حاصل کی جائے۔

تقوی کا تیسرا اہم تقاضا حقوق الناس کی ادائیگی اور حسن اخلاق ہے۔

جب یہ چیزیں اہل علم کے ہاں پوری ہوجائیں گی، تو دین کے اندرونی دشمنوں کا ناطقہ بند ہوجائے گا، اور بیرونی دشمنوں کے خلاف اللہ رب العزت خصوصی امداد ونصرت فرمائیں گے۔ اس طرح عصر حاضر کے تمام درپیش چیلنجوں کا مقابلہ اور فتنوں سے بچاؤ نہایت آسان ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

درس قرآن مجید

تراث رحمانی در فوائد قرآنی

ڈاکٹر اسماعیل محمد امین

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ [سورة البقرة: ٨٣]

ترجمہ: ''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں سے احسان کرو گے۔ اور لوگوں سے اچھی بات کہو، نماز قائم کرو، زکاۃ دو، پھر کم ہی افراد کے سوا تم لوگ پھر گئے، اور تم منہ پھیرنے والے تھے۔''

سابقہ آیات سے ربط اور مختصر تفسیر:

سابقہ آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کی بے راہروی کی بنیادی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بڑی خطرناک غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی تردید فرماتے ہوئے جنت اور جہنم کے حقدار بننے کے حقیقی اصول واضح بیان فرمائے۔ اسی طرح بنی اسرائیل پر کی گئی تاریخی احسانات یاد دلا کر ان کی ناقدری پر بار بار عتاب فرمایا۔ زیر تفسیر آیت مبارکہ میں ان سے لیے گئے ایک اہم ترین عہد کی یاد دہانی کی گئی ہے۔

امام بقاعیؒ کہتے ہیں: جب گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود بھی اگر شرک وکفر کریں اور ان کے گناہ انہیں گھیر لیں تو یہ بھی یقیناً جہنمی ہوں گے اور ان بیچاروں کی خوش فہمیاں کچھ کام نہ آئیں گی۔ زیر تفسیر آیت میں اس کی دلیل پیش کی جارہی ہے کہ تم لوگوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عقیدہ توحید پر پابندی کا وعدہ لیا تھا۔[نظم الدرر في تناسب الآيات والسور ٢/٢]

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ﴾ میں و عاطفہ ہے، إذ جب۔ ﴿مِيْثَاق﴾ وِثَاق سے اسم ہے یہ قیدی کو مضبوط باندھنے والی رسی کو کہا جاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَشُدُّوا الْوِثَاقَ﴾ ''انہیں مضبوط باندھ لو۔'' اسی لفظ سے ﴿میثاق﴾ بنا ہے۔ پس یہ انتہائی پختہ، مضبوط، بھاری اور تأکیدی عہد و پیمان کو کہا جاتا ہے۔ عہد کی تأکید قسم اور خلاف

درزی پر سخت وعید اور تخویف کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ﴿بنی اسرآئیل﴾ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ذکور واناث سب شامل ہیں۔ یہ اصلاً عرب یعنی بنی اسماعیل کے چچازاد ہیں اور سب کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

مذکورہ ﴿میثاق﴾ کے حوالے سے امام قرطبیؒ نے دو اقوال ذکر کیے ہیں: (۱) جب حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نسل انسانی نکالی گئی تو عالم ذر میں ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ﴾ والا میثاق لیا گیا تھا۔ امام ابن عطیہؒ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ (۲) دنیا میں انبیاء کرام کے ذریعے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا تھا۔ سیاقِ قرآنی کی روشنی میں یہی قول راجح ہے۔

﴿لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ سیبویہ کے بقول جملہ جوابِ قسم ہے۔ یعنی: واللہِ لا تعبدون اِلا اللّٰہَ. دوسرے قول کے مطابق یہ جملہ خبریہ ہے، لیکن انشائیہ یعنی نھــی کے معنی میں ہے۔ نفی سے نہی مراد لینا مبالغہ ہے۔ ایک قراءت لا تعبدوا بھی ہے۔ نیز بعد کے ﴿ وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ کا ﴿لا تعبدون﴾ پر عطف سے بھی نہی کا معنی اقرب لگتا ہے۔ بعض کے نزدیک ﴿لا تعبدون﴾ أن لا تعبدوا ہے۔ پھر أن کو حذف کرنے پر ﴿لا تعبدونَ﴾ مرفوع ہوا ہے۔ تیسری قراءت لا یعبدون ہے۔ امام قرطبیؒ کہتے ہیں: اس قراءت سے حال کا معنی زیادہ درست ہے۔ یعنی جب ہم نے عہد لیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں گے۔ زیرِ تفسیر آیت میں لیا گیا میثاق آٹھ امور پر مشتمل ہے:

{1}: توحید: ﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ عبادة کے اصل معنی التذلُّل والخُضوع ہے۔ یعنی معبود کے سامنے انتہائی عاجزی، تذلل اور انکساری سے جھکنا۔ اسی سے عام استعمال کا راستہ طریقٌ معبَّدٌ کہلاتا ہے۔ عبادت میں تذلل کے ساتھ ''محبت'' بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی کسی کے سامنے اس کے خوف وقہر کی وجہ سے جھکتا ہے، تو اسے عبادت نہیں کہا جائے گا۔ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں: العبادةُ اسمٌ جامعٌ لکلِّ ما یحبُّه اللهُ ویرضاهُ مِن الأقوالِ والأعمالِ الظاهرةِ والباطنةِ. عبادت اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ اقوال واعمال پر مشتمل جامع نام ہے، خواہ یہ امور قولی ہوں یا عملی، ظاہری ہوں یا باطنی (یعنی قلبی وذہنی) [العبودیة ص۱۹] عبادت کی قبولیت کے لیے دو بنیادی شرائط ہیں: [1] اخلاصِ نیت [2] اتباعِ سنت۔ [دیکھیے: التراث 10 ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ﴾

{2}: والدین سے احسان کرنا: ﴿ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ طبریؒ: یہ ﴿لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ پر عطف ہے۔ تقدیری کلام ہے: أن لا تعبدوا إلا اللهَ وبأن تُحسِنوا إلی الوالدینِ إحسانًا ﴿إحسانًا﴾ تُحسِنُوا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ بعض نے أحسِنوا إلی الوالدینِ إحسانا مقدر مانا ہے۔ والد کو والدہ پر غلبہ دیتے

ہوئے صیغہ مذکر لایا ہے۔''إحسان'' نیکی اور حسن سلوک کا انتہائی درجہ ہے۔ والدین سے احسان کا حکم عام احسان کے تمام طریقوں کو شامل ہے۔ قول، فعل، مال، جاہ اور مقام ہر اعتبار سے احسان کرنا اس میں داخل ہے۔

{3}: رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرنا: ﴿وَذِي الْقُرْبٰى﴾ یہ فقرہ ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ پر عطف کی وجہ سے ذي مجرور ہے۔ ﴿الْقُرْبٰى﴾ فُعْلٰى کے وزن پر مصدر ہے، جیسے: رُجْعٰى، عُقْبٰى. قربت مني رحم فلانٍ قرابةً وقُربٰى وقُرْبًا اور تینوں ہم معنی ہیں۔ ﴿والدين﴾ کے بعد ﴿ذى القربى﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ رشتہ داری کا سبب بھی والدین ہیں۔ بلکہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی والدین کے ساتھ احسان کا بھی تقاضا ہے۔

{4}: یتیموں کے ساتھ حسن سلوک: ﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ يتامىٰ يتيم کی جمع ہے۔ یتیم اصلاً انفراد اور اکیلے پن کو کہا جاتا ہے۔ جس شعر سے پہلے یا بعد میں کوئی مصرع نہ ہو، اسے بیت یتیم کہا جاتا ہے۔ شریعت میں اس نابالغ بچے یا بچی کو کہا جاتا ہے، جس کا باپ وفات پا گیا ہو۔ ماوردیؒ نے نقل کیا ہے کہ جس بچے کی ماں فوت ہو جائے اسے بھی یتیم کہا جاتا ہے۔ اور جس جانور کی ماں نہ ہو اسے یتیم کہا جاتا ہے۔ باپ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اولاد پرورش، تربیت اور سرپرستی سے محروم ہوتی ہے، اس لیے وہ قابل رحم وشفقت ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

{5}: مساکین کے ساتھ احسان کرنا: ﴿وَالْمَسٰكِيْنَ﴾ المَسْكَنَة فقر وحاجت کی وجہ سے ذلت اور عاجزی کو کہا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: أسكنته الحاجةُ والفقرُ. اسے حاجت اور فقر نے بٹھا دیا۔ کیونکہ انسان بے نیازی سے سرکش اور متکبر ہو جاتا ہے۔ جمہور محدثینؒ اور فقہاءؒ کے نزدیک مسکین، فقیر سے کم ضرورت مند ہوتا ہے۔ کیونکہ فقیر کے پاس کچھ نہیں ہوتا، لیکن مسکین کے پاس کچھ مال ہوتا ہے، جو اس کی حاجات کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ﴾ [الكهف] فرمانِ نبوی ہے: ''لكن المسكين الذي ليس له غِنى'' [البخاري ١٤٧٦] ''مسکین وہ ہے جس کی ضرورت پوری نہ ہو۔'' یہی قول راجح ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک فقیر مسکین سے بہتر حال والا ہوتا ہے، اور بعض کے نزدیک دونوں کی حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔

محققین کے نزدیک: إذا اجتمعا تفرقا وإذا تفرقا اجتمعا یعنی دونوں ایک سیاق میں ہوں تو ہم معنی ہوں گے ورنہ مختلف، جس طرح إسلام وإيمان ہے۔ آیت میں مسکین کا ذکر ہے، تو فقیر بھی اس میں شامل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے مسکین کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا ہے، تو فقیر بالاولیٰ احسان کا حقدار ہوگا۔

{6}: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اللہ تعالیٰ نے والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان

کا حکم فرمانے کے بعد تمام لوگوں سے اچھی بات کرنے کا حکم دیا۔

حافظ ابن کثیرؒ توجیہ پیش کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے عملی احسان کے بعد قولی احسان کا حکم فرمایا ہے۔

﴿حُسْنًا﴾ مصدر اور معنوی فعل کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اس کا معنی ہے: لِيَحْسُنْ قَوْلُكُمْ يا قولوا للناسِ قولا حسنًا يا قولوا ذا حُسنٍ. ایک اور قراءت میں حَسَنًا ہے۔القول الحسن میں بات کی ہیئت اور معنی دونوں لحاظ سے خوبصورتی شامل ہے۔ ہیئت سے مراد اندازِ بیان کا حسن ہے، جیسے نرمی سے گفتگو کرنا اور معنوی حسن سے مراد خیر ہونا ہے۔اور ہر خیر والی بات دراصل خوبصورت ہوتی ہے۔☆

{7}: نماز قائم کرنے کا حکم: امام ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں سے احسان کا حکم دینے کے بعد اپنی طرف سے مقرر عبادتوں کی بجا آوری کا حکم فرمایا: ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ إقامة الصلاة کی تفصیلی تفسیر دیکھیے: مجلّہ التراث شمارہ:38

تفسیر سلف صالحینؒ کی روشنی میں ''اقامت صلاۃ'' سے مراد نماز کو پابندی کے ساتھ مکمل آداب، شرائط، ارکان اور سنن کے مطابق باجماعت ادا کرنا ہے۔اس میں فرض اور نفل نمازیں سب شامل ہیں۔

بنی اسرائیل کو حکم دی ہوئی نماز وہی عبادت ہے، جس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمائی تھی۔

{8}: ادائیگیٔ زکاۃ کا حکم: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ آتوا بمعنی أعطوا ہے، یعنی: ''دے دو'' زکاۃ کی اہمیت التراث شمارہ:38 میں گزر چکی ہے۔شرعاً زکاۃ مالداروں کے اموال سے اس مخصوص حق کو کہا جاتا ہے، جو مخصوص شروط اور نصاب مکمل ہونے وصول کر کے مخصوص اصناف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل پر فرض کردہ زکاۃ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے دو مختلف روایات وارد ہوئی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اموال سے زکاۃ مقرر فرمایا تھا، لیکن ان کی زکاۃ کی قبولیت آسمانی آگ کا آ کر جلانا تھی۔

☆ ہیئت کا حسن انسان اخلاق حسنہ اور مناسب الفاظ کے انتخاب سے پیدا کر سکتا ہے۔لیکن مخاطَب کا جذبہ اور تعصب بسا اوقات حق بات کو برداشت نہیں کرتا اور برا مناتا ہے، اگرچہ اخروی انجام کے لحاظ سے اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ایسے حالات میں ہمیں مخاطب کی پسند کے بجائے انجام کو اہمیت دینا چاہیے، جیسے کہ فرمان نبوی ہے: "قُلِ الحقَّ ولو كانَ مُرًّا" [ابن حبان ٣٦١، وصححه الألباني الصحيحة ٢١٦٦] ''حق بات کرو، اگرچہ کڑوی ہو۔''